ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3909

Program: BS Islamic Studies (Spec. Seerat Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: سیرت النبی ﷺ کا موضوعاتی مطالعہ (دعوتی و اخلاقی پہلو) (3909)

سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص سیرت سٹڈیز)

سمسٹر: خزاں 2026ء

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ 1-4)

Reference & For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

حل شدہ امتحانی مشق رہنما — برائے مطالعہ و حوالہ

نوٹ: یہ رہنما صرف مطالعے اور حوالے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس کا خود مطالعہ کریں، مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر جواب اپنے الفاظ میں، اپنی سمجھ اور اپنے انداز میں تحریر کریں۔ اس رہنما کو ہو بہو نقل کرنا نہ علمی دیانت کے مطابق ہے اور نہ ہی امتحانی کامیابی کے لیے مفید؛ اصل کامیابی اسی میں ہے کہ طالب علم موضوع کو سمجھ کر اپنی زبان میں پیش کرے۔ اس گائیڈ میں دینی حوالے تعلیمی و تحقیقی انداز میں پیش کیے گئے ہیں؛ کسی خاص فرد یا واقعے پر شرعی حکم کا اطلاق مستند علماء اور متعلقہ مجاز فورم ہی کا اختیار ہے۔

سوال نمبر 1: موجودہ دور میں اساتذہ کی اخلاقی تربیت کے مؤثر طریقے — سیرتِ طیبہ کی روشنی میں (20 نمبر)

موجودہ دور میں اساتذہ اپنے طلبہ کی اخلاقی تربیت کن مؤثر طریقوں سے کر سکتے ہیں؟ سیرتِ طیبہ کی روشنی میں ان طریقوں پر تفصیلی بحث کریں۔

تعارف

تعلیم کا مقصد صرف معلومات کی منتقلی نہیں بلکہ کردار کی تعمیر بھی ہے۔ استاد محض پڑھانے والا نہیں ہوتا، وہ طلبہ کی شخصیت، سوچ اور رویوں کو تشکیل دینے والا معمار ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے خود کو معلم قرار دیا اور آپ ﷺ کی پوری سیرت اس حقیقت کی عملی تفسیر ہے کہ اخلاقی تربیت تدریس سے زیادہ طرزِ عمل، محبت، حکمت اور تدریج سے ہوتی ہے۔ سورۃ آل عمران (3:164) کے مفہوم کے مطابق رسول کریم ﷺ کے مقاصد میں آیات کی تلاوت کے ساتھ تزکیہ یعنی نفوس کی پاکیزگی اور کتاب و حکمت کی تعلیم شامل ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ تربیت نبوی ﷺ میں علم اور اخلاق لازم و ملزوم تھے۔

موجودہ دور میں استاد کے سامنے نئے چیلنجز ہیں: سوشل میڈیا کا بے لگام استعمال، مادہ پرستی، مقابلے کا دباؤ، خاندانی نظام کی کمزوری اور فوری کامیابی کی خواہش۔ ان حالات میں اگر استاد صرف نصاب مکمل کرنے تک محدود رہے تو طلبہ کے اخلاق پر اس کا اثر کمزور پڑ جاتا ہے۔ زیرِ نظر جواب میں سیرتِ طیبہ کی روشنی میں ان مؤثر طریقوں کا جائزہ لیا جائے گا جن سے آج کا استاد اپنے طلبہ کی اخلاقی تربیت کر سکتا ہے، اور ہر طریقے کو عملی تدریسی زندگی سے جوڑ کر پیش کیا جائے گا۔

پہلا طریقہ: ذاتی نمونہ اور اسوۂ حسنہ

اخلاقی تربیت کا سب سے مؤثر طریقہ استاد کا اپنا کردار ہے۔ طلبہ استاد کی باتوں سے زیادہ اس کے عمل کو دیکھتے اور نقل کرتے ہیں۔ سورۃ الاحزاب (33:21) میں رسول اللہ ﷺ کی ذات کو بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے، اور سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ ﷺ نے جو تعلیم دی پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ صدق، امانت، وقت کی پابندی، انصاف اور نرمی جیسی صفات آپ ﷺ کے روزمرہ معمولات میں نمایاں تھیں، اسی لیے صحابہ کرام کے دلوں میں وہ نقش ہو گئیں۔ آج کا استاد بھی اگر سچائی میں، وعدے کی پاسداری میں، طلبہ کے ساتھ انصاف میں اور اپنے لب و لہجے میں وہی معیار قائم رکھے جو وہ طلبہ سے چاہتا ہے تو اس کی خاموش تربیت اس کے لیکچرز سے زیادہ اثر رکھے گی۔

عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ استاد غلطی ہو جائے تو اسے تسلیم کرے، کسی طالب علم کے حق میں کوتاہی ہو تو معذرت کرے، اور کلاس میں اصول سب کے لیے یکساں رکھے۔ جب طلبہ دیکھتے ہیں کہ استاد امیر و غریب، ذہین و کمزور سب کے ساتھ ایک جیسا منصفانہ سلوک کرتا ہے تو انصاف ان کے مزاج کا حصہ بننے لگتا ہے۔ اس کے برعکس اگر

استاد خود وقت ضائع کرے، کڑوا بولے یا جانبداری کرے تو اخلاق پر اس کی نصیحتیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا سیرت کی روشنی میں پہلی تربیتی بنیاد استاد کی اپنی ذات کی اصلاح اور مستقل خود احتسابی ہے۔

دوسرا طریقہ: محبت، شفقت اور تعلق کی فضا

سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تربیت محبت اور شفقت کے ماحول میں ہوئی۔ بچوں اور نوجوانوں کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ ہمیشہ رحمت بھرا رہا؛ آپ ﷺ ان کی بات سنتے، ان کی سطح پر اتر کر گفتگو کرتے اور ان کی غلطی پر ڈانٹنے کے بجائے نرمی سے اصلاح فرماتے۔ تربیت کے ماہرین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بچہ اسی شخص سے اخلاق سیکھتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے اور جس کے سامنے وہ خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ خوف کی فضا وقتی اطاعت تو پیدا کر سکتی ہے مگر پائیدار کردار نہیں بنا سکتی۔

آج کے استاد کے لیے اس کا عملی ترجمہ یہ ہے کہ وہ طلبہ کے نام یاد کرے، ان کی بات توجہ سے سنے، ان کی چھوٹی کامیابیوں کی حوصلہ افزائی کرے اور مشکل میں ان کی رہنمائی کو ذاتی دلچسپی سے لے۔ کلاس میں طنز، تضحیک اور دوسروں کے سامنے شرمندہ کرنے سے پرہیز سیرت کی اسی شفقت کا تقاضا ہے۔ جب طالب علم کو اعتماد ملتا ہے کہ استاد اس کا خیر خواہ ہے تو وہ اصلاح کو دل سے قبول کرتا ہے اور استاد کی ہدایت اس کے لیے بوجھ کے بجائے سہارا بن جاتی ہے۔ یہی تعلق آگے چل کر سچائی، خود اعتمادی اور دوسروں کے احترام جیسی اقدار کی جڑ بنتا ہے۔

تیسرا طریقہ: حکمت، تدریج اور موقع شناسی

نبی اکرم ﷺ کی تربیتی حکمتِ عملی میں تدریج اور موقع شناسی کو بنیادی مقام حاصل تھا۔ آپ ﷺ احکام و اخلاق کی تعلیم یکدم بوجھ بنا کر نہیں دیتے تھے بلکہ مخاطب کی ذہنی سطح، عمر اور حالات کو دیکھ کر بات فرماتے۔ سیرت کی کتابوں میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ آپ ﷺ نے سوال کرنے والے کی ضرورت کے مطابق جواب دیا، کسی کو

ایک نصیحت فرمائی اور کسی کو دوسری، کیونکہ ہر شخص کی کمزوری اور ضرورت مختلف ہوتی ہے۔ اسی اصول کو قرآن مجید نے دعوت و تربیت کے لیے حکمت اور اچھی نصیحت کے الفاظ میں بیان کیا ہے (دیکھیے: النحل 16:125 کے مفہوم)۔

موجودہ کلاس روم میں اس اصول کا اطلاق یہ ہے کہ استاد تمام طلبہ کو ایک ہی پیمانے سے نہ ناپے۔ کمزور طالب علم کے لیے چھوٹے چھوٹے ہدف، مرحلہ وار توقعات اور مسلسل حوصلہ افزائی رکھی جائے؛ لائق طالب علم کو ذمہ داری اور قیادت کے مواقع دیے جائیں۔ اخلاقی غلطی پر فوری سخت سزا کے بجائے پہلے وجہ سمجھی جائے، پھر تنہائی میں نرمی سے سمجھایا جائے اور بہتری کا موقع دیا جائے۔ تدریج سے بننے والی عادت پائیدار ہوتی ہے، جبکہ اچانک دباؤ سے پیدا ہونے والی تبدیلی اکثر عارضی نکلتی ہے۔ سیرت کا یہی تدریجی منہج آج کے استاد کے لیے سب سے قابلِ عمل رہنما ہے۔

چوتھا طریقہ: قصص، مثال اور عملی مشق

سیرتِ طیبہ میں اخلاقی تعلیم کا ایک مؤثر ذریعہ واقعات اور مثالوں کا استعمال ہے۔ آپ ﷺ تجریدی اصول بیان کرنے کے ساتھ زندگی کے واقعات، سوال و جواب اور سادہ مثالوں سے بات کو دل نشین فرماتے۔ انسانی ذہن کہانی اور مثال کو نصیحت سے زیادہ دیر تک یاد رکھتا ہے، کیونکہ کہانی میں کردار، صورتِ حال اور نتیجہ تینوں موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے سیرت، صحابہ کرام کی زندگیوں اور تاریخ کے سبق آموز واقعات آج بھی اخلاقی تدریس کا بہترین سرمایہ ہیں، بشرطیکہ وہ مستند ماخذ سے لیے جائیں اور سنسنی کے بجائے سبق پر توجہ رہے۔

عملی مشق اس طریقے کی تکمیل ہے۔ استاد جماعت میں گروہی سرگرمیوں، خدمتِ خلق کے چھوٹے منصوبوں، صفائی، کتابوں کی دیکھ بھال، ساتھی کی مدد اور مشترکہ ذمہ داریوں کے ذریعے طلبہ کو سچائی، تعاون، ایثار اور ذمہ داری کا تجربہ کرا سکتا ہے۔ اخلاق پڑھنے سے نہیں، کرنے سے بنتا ہے۔ جب طالب علم خود کسی کی مدد کر کے اس کی خوشی محسوس کرتا ہے تو ایثار اس کے لیے کتابی لفظ نہیں رہتا بلکہ ذاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ سیرت کے واقعات سمجھ دیں اور عملی مشق عادت بنائے، یہ امتزاج تربیت کو مکمل کرتا ہے۔

پانچواں طریقہ: مثبت ترغیب، انصاف پسند جائزہ اور اصلاح کا منصفانہ نظام

تربیت میں صرف غلطی پر گرفت سے کردار نہیں بنتا؛ اچھے عمل کی قدر دانی اور واضح ترغیب بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ سیرت میں نیکی پر حوصلہ افزائی، اچھے نام اور اچھے گمان کے ساتھ مخاطب کرنے اور چھوٹی نیکی کو بھی اہمیت دینے کی روش ملتی ہے۔ استاد اگر طلبہ کی ایمانداری، وقت کی پابندی، صفائی اور تعاون کو سب کے سامنے سراہے تو باقی طلبہ کے لیے وہ عمل قابلِ تقلید بن جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ نمبروں اور جائزے میں مکمل انصاف بھی اخلاقی تربیت ہی ہے، کیونکہ ناانصافی طالب علم کو نظام سے بددل اور بدظن کر دیتی ہے۔

اصلاح کے نظام میں توازن ضروری ہے۔ غلطی کی نوعیت دیکھی جائے، پہلی بار نرمی، دہرانے پر مناسب تنبیہ اور دانستہ بداخلاقی پر متناسب تدبیر اختیار کی جائے، مگر ہر حال میں طالب علم کی عزتِ نفس محفوظ رہے۔ والدین کے ساتھ رابطہ بھی اسی نظام کا حصہ ہے تاکہ گھر اور مدرسہ ایک ہی اخلاقی پیغام دیں۔ یاد رہے کہ کسی طالب علم کے بارے میں حتمی اخلاقی فیصلہ سنانے کے بجائے استاد کا کام رہنمائی اور موقع دینا ہے؛ کردار کی تبدیلی تدریجی عمل ہے جس میں صبر سب سے اہم شرط ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سیرتِ طیبہ کی روشنی میں اخلاقی تربیت کے مؤثر طریقے پانچ ستونوں پر کھڑے ہیں: استاد کا ذاتی نمونہ، محبت و شفقت کا تعلق، حکمت و تدریج، قصص و عملی مشق، اور ترغیب و انصاف پر مبنی اصلاحی نظام۔ موجودہ دور کے چیلنجز جتنے بھی نئے ہوں، انسانی فطرت وہی ہے جس کی تربیت سیرت نے کی تھی؛ اس لیے یہ طریقے آج بھی اتنے ہی کارآمد ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ استاد انہیں رسمی نصیحت کے بجائے اپنی روزمرہ تدریسی زندگی کا حصہ بنائے۔ ایسا استاد محض نصاب نہیں پڑھاتا، وہ نسلیں سنوارتا ہے، اور یہی تعلیم کا اصل مقصد اور سیرتِ طیبہ کا اصل پیغام ہے۔

سوال نمبر 2: حقوق کا مفہوم، ادائیگی کی اہمیت اور والدین کے حقوق (20 نمبر)

حقوق کا مفہوم اور حقوق کی ادائیگی کی اہمیت بیان کریں نیز والدین کے حقوق پر نوٹ لکھیں۔

تعارف: حقوق کا مفہوم

حق کا لفظی مفہوم ثابت شدہ، واجب اور مستحق چیز کا ہے۔ اصطلاح میں حق سے مراد وہ جائز مطالبہ یا استحقاق ہے جو شریعت، قانون یا اخلاقی اصولوں نے کسی فرد کو عطا کیا ہو اور جس کی ادائیگی دوسروں پر لازم ہو۔ یوں ہر حق کے ساتھ ایک ذمہ داری جڑی ہوتی ہے: اگر ایک شخص کا حق ہے تو دوسرے کا فرض ہے کہ وہ اس حق کو ادا کرے۔ اسلام نے انسانی زندگی کو حقوق و فرائض کے متوازن نظام میں ڈھالا ہے۔ حقوق کی عمومی تقسیم میں اللہ کے حقوق یعنی عبادت و اطاعت، اور بندوں کے حقوق شامل ہیں، اور بندوں کے حقوق میں والدین، اولاد، شریکِ حیات، رشتہ دار، پڑوسی، اساتذہ، ماتحت، مہمان اور عام انسانوں کے حقوق آتے ہیں۔ ان میں سے ہر حق کی اپنی جگہ اور اپنا درجہ ہے۔

یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ حقوق محض قانونی ضابطے نہیں بلکہ اخلاقی و روحانی ذمہ داری بھی ہیں۔ قانون گرفت اسی وقت کرتا ہے جب معاملہ عدالت تک پہنچے، مگر ایمان و اخلاق انسان کو تنہائی میں بھی حق ادا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اسی لیے اسلامی تعلیمات میں حقوق العباد کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ بندوں کے حقوق میں کوتاہی محض عبادات سے پوری نہیں ہوتی بلکہ صاحبِ حق سے معافی یا ادائیگی ضروری ہے۔ کسی خاص کیس میں حق کے تعین اور اس کے شرعی حکم کا حتمی فیصلہ بہرحال مستند علماء اور مجاز عدالتی فورم کا کام ہے؛ یہاں مقصد صرف عمومی تعلیمی وضاحت ہے۔

حقوق کی ادائیگی کی اہمیت

حقوق کی ادائیگی معاشرے کے امن و انصاف کی بنیاد ہے۔ جس گھر اور جس معاشرے میں ہر فرد کو اس کا حق وقت پر ملتا ہے وہاں اعتماد، محبت اور تعاون پروان چڑھتا ہے؛ اور جہاں حقوق پامال ہوتے ہیں وہاں شکایت، نفرت، مقدمہ بازی اور بے چینی جنم لیتی ہے۔ خاندانی جھگڑوں، کاروباری تنازعات اور سماجی بے اطمینانی کی بڑی وجوہات میں سے ایک یہی ہے کہ لوگ اپنے حقوق تو خوب جانتے ہیں مگر دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں سستی کرتے ہیں۔ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس نے حق کو صرف مطالبہ نہیں بنایا بلکہ ادائیگی کو عبادت اور آخرت کی کامیابی سے جوڑ دیا، تاکہ مومن دوسرے کا حق خوشی سے ادا کرے نہ کہ مجبوری سے۔

حقوق کی ادائیگی کی اہمیت کا ایک پہلو نفسیاتی بھی ہے۔ جب انسان دوسروں کے حقوق ادا کرتا ہے تو اس کے دل میں سکون، ضمیر میں اطمینان اور تعلقات میں گرم جوشی پیدا ہوتی ہے۔ والدین کی خدمت کرنے والے کو ان کی دعائیں ملتی ہیں، مزدور کو وقت پر مزدوری دینے والے سے اس کی محبت بڑھتی ہے اور انصاف کرنے والے استاد کی عزت دلوں میں قائم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس حق تلفی وقتی فائدہ دے بھی دے تو آخر کار بدنامی، تعلقات کی خرابی اور ضمیر کی ملامت اس کا انجام بنتی ہے۔ لہٰذا حقوق کی ادائیگی محض سماجی ضرورت نہیں، فرد کی اپنی شخصیت و آخرت کی بھلائی کا ذریعہ بھی ہے۔

والدین کے حقوق: قرآن و سیرت کی روشنی میں عمومی جائزہ

بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم اور سب سے زیادہ تاکید والدین کے حقوق پر کی گئی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل (17:23-24) کے مفہوم میں والدین کے ساتھ احسان، نرمی، عاجزی اور ان کے لیے دعا کی تعلیم دی گئی ہے اور بڑھاپے میں انہیں سختی سے جواب دینے سے بھی روکا گیا ہے۔ سورۂ لقمان (31:14) کے مفہوم میں ماں کی تکالیف کا ذکر کر کے شکر گزاری کا حکم اللہ کے شکر کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ ان آیات کے مفاہیم سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں: والدین کا حق اللہ کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے، یہ حق ان کی مادی خدمت تک محدود نہیں بلکہ لہجے، رویے اور دعا تک پھیلا ہوا ہے، اور یہ حق ان کی زندگی میں بھی ہے اور وفات کے بعد دعا و صدقے کی صورت میں بھی جاری رہتا ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ بھی ان حقوق کی عملی تصویر پیش کرتی ہے۔ آپ ﷺ کے ارشادات کے مفاہیم میں والدین کی رضا کو اللہ کی رضا سے اور ان کی ناراضی کو اللہ کی ناراضی سے جوڑا گیا ہے، اور ماں کے حق کو باپ کے مقابلے میں زیادہ تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس کی وجہ اس کی زیادہ تکالیف اور قربانیاں ہیں۔ یاد رہے کہ یہاں قرآنی آیات اور احادیث کے مفاہیم اپنے الفاظ میں بیان کیے جا رہے ہیں؛ عین الفاظ اور ان کی تشریح کے لیے مستند تفاسیر و شروح کا مطالعہ کرنا چاہیے، اور کسی خاص صورت میں شرعی رہنمائی اہلِ علم سے لینی چاہیے۔

والدین کے عملی حقوق کی تفصیل

والدین کے حقوق کو چند عملی صورتوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اول، ادب و احترام: ان سے نرم اور شائستہ لہجے میں بات کرنا، ان کی بات توجہ سے سننا، ان کے سامنے آواز بلند نہ کرنا اور ان کے دوستوں و رشتہ داروں کی بھی عزت کرنا۔ دوم، اطاعت و فرمانبرداری: جائز اور نیک کاموں میں ان کی بات ماننا اور ان کی پسند کا خیال رکھنا؛ البتہ اگر کسی بات میں اللہ کی نافرمانی لازم آئے تو شریعت کا عمومی اصول یہ ہے کہ مخلوق کی اطاعت خالق کی نافرمانی میں نہیں کی جاتی، مگر اس صورت میں بھی ان سے نرمی اور حسنِ سلوک برقرار رکھنا ضروری ہے، اور خاص صورتوں میں رہنمائی علماء سے حاصل کرنی چاہیے۔

سوم، مادی خدمت و کفالت: بڑھاپے اور ضرورت کے وقت ان کے کھانے، علاج، رہائش اور دیگر ضروریات کا اہتمام اپنی استطاعت کے مطابق کرنا، اور اس خدمت کو احسان جتانے کے بجائے سعادت سمجھنا۔ چہارم، وقت اور توجہ: آج کے دور میں والدین کی سب سے بڑی شکایت مادی نہیں بلکہ وقت اور توجہ کی کمی ہے؛ باقاعدہ ملاقات، فون پر خیریت دریافت کرنا اور ان کی باتیں سننا بھی حقوق ہی میں شامل ہے۔ پنجم، دعا و ایصالِ ثواب: ان کی زندگی میں صحت و عافیت کی دعا اور وفات کے بعد ان کے لیے دعائے مغفرت اور صدقہ بھی اولاد کا حق سمجھا جاتا ہے۔ ششم، ان کے قرض و جائز وصیت کی تکمیل میں مدد اور ان کے بعد ان کے رشتہ داروں سے حسنِ سلوک بھی سیرت کی تعلیمات میں والدین کی خدمت کا تسلسل قرار پاتا ہے۔

موجودہ دور میں والدین کے حقوق کی صورتِ حال اور اصلاح کی تجاویز

موجودہ دور میں والدین کے حقوق کی پامالی کی چند نمایاں وجوہات ہیں۔ مشترکہ خاندانی نظام کی کمزوری اور شہروں کی مصروف زندگی نے فاصلے بڑھا دیے ہیں؛ مادہ پرستی نے یہ سوچ پیدا کر دی ہے کہ والدین کو پیسے بھیج دینا ہی خدمت ہے، حالانکہ وہ توجہ اور ساتھ کے بھوکے ہوتے ہیں۔ سوشل میڈیا اور موبائل نے ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی دلوں کے فاصلے بڑھا دیے ہیں۔ بعض اوقات اولاد کی اپنی گھریلو ذمہ داریاں اور معاشی دباؤ بھی عملی رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان وجوہات کو سمجھنا اصلاح کی پہلی سیڑھی ہے، کیونکہ ہر مسئلے کا حل اس کی نوعیت کے مطابق ہوتا ہے۔

اصلاح کے لیے چند عملی تجاویز مفید ہیں: والدین کے لیے باقاعدہ وقت مقرر کرنا، ان کی صحت کے معاملات کی خود نگرانی کرنا، بڑھاپے کی کمزوری پر درگزر کرنا، چھوٹے بچوں کو دادا دادی اور نانا نانی سے جوڑے رکھنا تاکہ تربیت نسل در نسل منتقل ہو، اور اختلاف کی صورت میں آواز بلند کرنے کے بجائے مناسب وقت پر نرمی سے بات کرنا۔ تعلیمی اداروں کو بھی والدین کے احترام کو محض ایک دن کی تقریب کے بجائے نصاب و تربیت کا حصہ بنانا چاہیے۔ جب اولاد یہ سمجھ لے کہ والدین کی خدمت بوجھ نہیں بلکہ اس کی اپنی دنیا و آخرت کی سرمایہ کاری ہے تو رویے خود بخود بدلنے لگتے ہیں۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ حقوق ایک متوازن نظام ہیں جس میں ہر شخص بیک وقت صاحبِ حق بھی ہے اور مکلف بھی۔ حقوق کی ادائیگی سے گھر میں محبت، معاشرے میں انصاف اور فرد کے ضمیر میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ والدین کے حقوق ان سب میں مقدم ہیں کیونکہ والدین انسان کے وجود، پرورش اور تربیت کا ذریعہ ہیں اور ان کی قربانیوں کا بدلہ مکمل طور پر ممکن ہی نہیں۔ ادب، اطاعت، خدمت، وقت، دعا اور حسنِ سلوک ان حقوق کی عملی صورتیں ہیں۔ طالب علم کے لیے اصل سبق یہ ہے کہ حقوق کا علم اسی وقت فائدہ مند ہے جب وہ اپنے گھر سے اس پر عمل شروع کرے۔

جدول 1: حقوق کی عمومی اقسام اور ان کی ادائیگی کی صورتیں

حق کی قسم	مثالیں	ادائیگی کی بنیادی صورت
حقوق اللہ	عبادت، اطاعت، شکر	فرائض کی پابندی
والدین کے حقوق	ادب، خدمت، دعا	حسنِ سلوک و کفالت
دیگر حقوق العباد	پڑوسی، رشتہ دار، ماتحت	انصاف، نرمی، وقت پر ادائیگی

سوال نمبر 3: عزم واستقلال — مفہوم، اہمیت اور صورتیں (20 نمبر)

عزم واستقلال کے مفہوم، اہمیت اور صورتوں پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

تعارف: عزم واستقلال کا مفہوم

عزم سے مراد کسی نیک مقصد کو حاصل کرنے کا پختہ ارادہ ہے، اور استقلال سے مراد مشکلات، رکاوٹوں اور وقتی ناکامیوں کے باوجود اس ارادے پر قائم رہنا ہے۔ دونوں مل کر ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں جسے عام زبان میں ثابت قدمی، ہمت اور مستقل مزاجی کہا جاتا ہے۔ عربی میں عزم کا مفہوم پختگی اور پکّا ارادہ ہے؛ اسی لیے قرآن مجید میں بلند ہمت رسولوں کو اولوالعزم کہا گیا ہے (دیکھیے: الاحقاف 46:35 کے مفہوم) اور عزم کے کاموں کو صبر کے ساتھ جوڑا گیا ہے (دیکھیے: لقمان 31:17 کے مفہوم)۔ عام خواہش اور عزم میں فرق یہ ہے کہ خواہش حالات کے ساتھ بدل جاتی ہے جبکہ عزم حالات کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔

استقلال کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ضد پر اڑ جائے یا غلطی پر ڈٹا رہے۔ حقیقی استقلال نیک اور درست مقصد پر قائم رہنے کا نام ہے؛ اگر راستہ غلط ثابت ہو تو اسے بدلنا بھی عقل مندی ہے، مگر مقصد سے پیچھے ہٹنا کمزوری ہے۔ اسی طرح عزم کا تعلق صرف بڑے کارناموں سے نہیں؛ روزمرہ کی چھوٹی ذمہ داریوں، نماز کی پابندی، مطالعے کے تسلسل اور وعدے کی پاسداری میں بھی عزم واستقلال اتنا ہی مطلوب ہے۔ گویا عزم آغاز کی قوت ہے اور استقلال اس قوت کو منزل تک لے جانے والی استقامت ہے۔

عزم واستقلال کی اہمیت

عزم واستقلال کی اہمیت اس لیے ہے کہ دنیا کا ہر بڑا کارنامہ اسی وصف کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ صلاحیت بہت سے لوگوں کے پاس ہوتی ہے مگر کامیابی انھی کو ملتی ہے جو مشکل مرحلے میں بھی رکنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ طالب علم کی زندگی میں اس کی مثال روز نظر آتی ہے: امتحان کی تیاری، مشکل مضمون کی سمجھ اور آرام کی قربانی، سب میں

استقلال ہی فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ میں یہ وصف انتہائی نمایاں ہے؛ دعوت کے مشکل ترین ادوار میں بھی آپ ﷺ اپنے مقصد پر قائم رہے اور وقتی ناکامی یا مخالفت کو راستے کا عام حصہ سمجھ کر آگے بڑھتے رہے۔ یہی استقامت صحابہ کرام کے دلوں میں بھی اتر گئی اور ایک چھوٹی سی جماعت نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی عزم انسان کو بے چینی سے بچاتا ہے۔ وہ شخص بار بار ارادے بدلتا ہے وہ ہر نئے کام میں ابتدائی مشکل دیکھ کر دل چھوڑ دیتا ہے اور اس کے اندر یہ احساس گھر کر لیتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس مستقل مزاج شخص چھوٹی چھوٹی کامیابیوں سے اعتماد حاصل کرتا ہے اور اس کا اعتماد مزید بڑے عزم کی بنیاد بنتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں بھی باثبات لوگ ہی قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں؛ کاروبار، ملازمت، وعدہ اور ذمہ داری ہر جگہ مستقل مزاجی ساکھ بناتی ہے۔ لہٰذا عزم و استقلال محض ذاتی خوبی نہیں بلکہ سماجی اعتبار کا ذریعہ بھی ہے۔

عزم و استقلال کی صورتیں: انفرادی زندگی میں

عزم و استقلال کی پہلی صورت عبادت و دینی زندگی میں نظر آتی ہے۔ نماز، روزہ اور دیگر فرائض کی پابندی وقتی جوش سے نہیں بلکہ مستقل مزاجی سے قائم رہتی ہے؛ موسم، مصروفیت اور مزاج کی تبدیلی کے باوجود معمول برقرار رکھنا ہی استقلال ہے۔ دوسری صورت علم و مطالعے میں ہے: روزانہ مقررہ وقت پر مطالعہ، مشکل مقام پر رک کر استاد سے پوچھنا اور نصاب مکمل کرنے تک تسلسل برقرار رکھنا طالب علمانہ عزم کی علامت ہے۔ تیسری صورت اخلاق و معاملات میں ہے: سچ بولنے پر قائم رہنا خواہ نقصان ہو، وعدہ پورا کرنا خواہ مشکل ہو، اور غصے کے موقع پر زبان و ہاتھ کو قابو میں رکھنا، یہ سب استقلال کی عملی شکلیں ہیں۔

چوتھی صورت مشکلات و مصائب میں ثابت قدمی ہے۔ بیماری، مالی تنگی یا کسی عزیز کی جدائی جیسے مراحل میں انسان کا عزم آزمایا جاتا ہے۔ سیرت کا سبق یہ ہے کہ ایسے وقت میں شکوے کے بجائے صبر، دعا اور جائز اسباب اختیار کیے جائیں۔ پانچویں صورت بری عادت چھوڑنے میں استقلال ہے۔ کسی بری عادت سے نجات ایک دن کا کام نہیں ہوتی؛ بار بار لغزش کے بعد دوبارہ کوشش ہی وہ راستہ ہے جس سے تبدیلی آتی ہے۔ جو شخص ایک ناکامی پر خود کو ہمیشہ کے لیے ناکام سمجھ لے وہ استقلال سے محروم ہے، جبکہ عزم والا شخص گر کر اٹھنے کو ہی زندگی کا اصول بنا لیتا ہے۔

عزم واستقلال کی صورتیں: اجتماعی و قومی زندگی میں

اجتماعی زندگی میں عزم واستقلال کی صورتیں اور وسیع ہو جاتی ہیں۔ قوموں کی تاریخ گواہ ہے کہ وسائل سے زیادہ فیصلہ کن چیز قوم کا اجتماعی عزم ہوتا ہے۔ تعلیمی ادارے، فلاحی تنظیمیں اور قومی منصوبے اسی وقت نتائج دیتے ہیں جب قیادت کارکن وقتی جوش کے بجائے طویل مدتی استقامت دکھائیں۔ سیرتِ نبوی ﷺ سے اس کی روشن مثال مدنی دور میں معاشرے کی تدریجی تعمیر ہے، جہاں مسجد، مؤاخات، میثاق اور تعلیم کا نظام قدم بہ قدم بڑے صبر اور منصوبہ بندی سے قائم ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استقلال کا مطلب جذباتی جلد بازی ہرگز نہیں بلکہ درست سمت میں مسلسل اور منظم کوشش ہے۔

آج کے دور میں نوجوان نسل کے لیے اس کی عملی صورتیں یہ ہیں: کیریئر میں بار بار میدان بدلنے کے بجائے ایک ہنر میں مہارت حاصل کرنا، سوشل میڈیا کی وقتی شہرت کے بجائے اصل قابلیت پر محنت کرنا، اور کاروبار یا نئی کوشش میں ابتدائی ناکامی کو آخری فیصلہ نہ سمجھنا۔ اسی طرح معاشرتی اصلاح کے کاموں اور تعلیم کی خدمت میں بھی مستقل مزاج افراد ہی دیرپا نتائج پیدا کرتے ہیں۔ ایک دن کی مہم آگاہی پیدا کر سکتی ہے مگر نظام وہی لوگ بدلتے ہیں جو سالوں تک بغیر شہرت کے کام کرتے رہتے ہیں۔

عزم واستقلال پیدا کرنے کے عملی طریقے

عزم واستقلال فطری صلاحیت بھی ہے اور قابلِ تربیت عادت بھی۔ اسے پیدا کرنے کا پہلا طریقہ مقصد کی وضاحت ہے: جس شخص کو معلوم ہو کہ وہ کیا اور کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے اس کا ارادہ مشکلات میں بھی برقرار رہتا ہے۔ دوسرا طریقہ بڑے مقصد کو چھوٹے مراحل میں تقسیم کرنا ہے تاکہ ہر مرحلے کی تکمیل حوصلہ بڑھائے۔ تیسرا طریقہ اچھی صحبت اور نمونوں کا مطالعہ ہے؛ سیرت و سوانح کا مطالعہ انسان کے اندر یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ مشکلات ہر بڑے انسان کی زندگی میں آتی ہیں۔ چوتھا طریقہ خود احتسابی اور روزانہ کا جائزہ ہے جس میں انسان اپنی کوتاہیوں کو شناخت کر کے اگلے دن کی اصلاح کا عہد کرتا ہے۔

پانچواں طریقہ دعا اور اللہ پر توکل ہے۔ اسلامی تصور میں عزم اسباب چھوڑنے کا نام نہیں بلکہ اسباب اختیار کر کے نتیجہ اللہ پر چھوڑنے کا نام ہے (دیکھیے: آل عمران 3:159 کے مفہوم، جس میں مشورے کے بعد عزم اور توکل کی ترتیب بیان ہوئی ہے)۔ چھٹا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹے وعدوں سے آغاز کیا جائے: وقت پر اٹھنا، مقررہ مطالعہ، کسی کام کی

وقت پر تکمیل، یہ چھوٹی پابندیاں بڑے عزم کی تربیت گاہ ہیں۔ آخری نکتہ یہ ہے کہ استقلال میں لچک بھی شامل رکھنی چاہیے؛ طریقہ کار بدلنا پڑے تو بدلیں مگر مقصد نہ چھوڑیں، اور غلطی ثابت ہو تو اسے تسلیم کرنا بھی عزم کی پختگی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ عزم نیک مقصد کا پختہ ارادہ ہے اور استقلال اس ارادے پر مشکلات کے باوجود قائم رہنے کا نام ہے۔ انفرادی عبادت و علم سے لے کر قومی تعمیر تک ہر میدان میں یہی وصف صلاحیت کو نتیجے میں بدلتا ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ اس وصف کی کامل ترین عملی صورت ہے جہاں نہ مخالفت نے راستہ روکا اور نہ وقتی ناکامی نے حوصلہ توڑا۔ آج کے طالب علم کے لیے سب سے اہم سبق یہ ہے کہ وہ بڑے ارادوں کے ساتھ چھوٹی پابندیوں سے آغاز کرے، ناکامی کو استاد سمجھے اور درست مقصد پر ثابت قدم رہے؛ یہی عزم و استقلال کی اصل روح ہے۔

سوال نمبر 4: قناعت کی اہمیت و افادیت اور مادیت پرستی کی روک تھام (20 نمبر)

قناعت کی اہمیت و افادیت سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں واضح کریں نیز موجودہ دور میں مادیت پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی روک تھام کے لیے تجاویز قلمبند کریں۔

تعارف: قناعت کا مفہوم

قناعت سے مراد اللہ کی عطا پر راضی رہنا، موجود وسائل پر شکر کے ساتھ اکتفا کرنا اور دوسروں کی نعمتوں کو دیکھ کر حرص و حسد میں مبتلا نہ ہونا ہے۔ قناعت سستی یا محنت سے گریز کا نام نہیں؛ قناعت کرنے والا شخص جائز اسباب اختیار کرتا ہے، محنت کرتا ہے اور ترقی کی کوشش بھی کرتا ہے، مگر اس کا دل دولت کے پیچھے بے چین نہیں رہتا اور وہ حلال و حرام کی حدیں نہیں توڑتا۔ اسلامی تعلیمات کا مفہوم یہ ہے کہ اصل غنا مال کی کثرت نہیں بلکہ نفس کی بے نیازی ہے۔ اسی کیفیت کو اطمینانِ قلب بھی کہا جاتا ہے جس میں انسان ضرورت اور نمود و نمائش کے فرق کو پہچان لیتا ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ قناعت کی کامل عملی تصویر ہے۔ آپ ﷺ کی ذاتی زندگی سادگی کی روشن مثال تھی؛ گھر کا سامان ضرورت تک محدود، کھانا سادہ اور لباس عام، جبکہ اسی کے ساتھ سخاوت اور دوسروں کو کھلانے پلانے میں آپ ﷺ سب سے آگے تھے۔ اس امتزاج سے سمجھ آتا ہے کہ قناعت کا مطلب خود تنگی میں رہنا اور دوسروں کو بھی محروم رکھنا نہیں، بلکہ اپنی ذات پر کم خرچ کر کے دوسروں کے لیے دل و دست کشادہ رکھنا ہے۔ یہی توازن قناعت کو بخل سے اور سادگی کو کنجوسی سے جدا کرتا ہے۔

قناعت کی اہمیت و افادیت

قناعت کی پہلی فائدہ مندی روحانی و ذہنی سکون ہے۔ حرص انسان کو کبھی مطمئن نہیں ہونے دیتی؛ ایک خواہش پوری ہو تو دوسری اس سے بڑی سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ قانع شخص کے لیے موجود نعمتیں خوشی کا ذریعہ بنتی ہیں، وہ دوسروں سے موازنہ کر کے خود کو محروم نہیں سمجھتا اور حسد جیسی بیماری سے بچا رہتا ہے۔ دوسری فائدہ مندی اخلاقی تحفظ ہے: دولت کی اندھی دوڑ انسان کو دھوکے، رشوت اور ناجائز ذرائع تک لے جا سکتی ہے، جبکہ قناعت اسے حلال پر قائم رکھتی ہے۔ تیسری افادیت معاشی توازن ہے؛ قانع شخص فضول خرچی اور دکھاوے کے قرض سے بچتا ہے، اس کی آمدنی کم بھی ہو تو زندگی منظم گزرتی ہے۔

چوتھی افادیت وقت اور توجہ کی آزادی ہے۔ جو شخص ہر وقت مزید کمانے اور مزید دکھانے کی فکر میں رہے اس کے پاس عبادت، خاندان اور خدمت کے لیے وقت نہیں بچتا؛ قانع شخص اپنی توانائیاں علم، نیکی اور تعلقات پر لگاتا ہے۔ پانچویں افادیت سماجی ہے: قناعت سے شکر گزاری بڑھتی ہے، شکر سے نرمی اور سخاوت بڑھتی ہے، اور معاشرے میں طبقاتی حسد و نفرت کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب پورا معاشرہ مادہ پرستی میں ڈوب جائے تو ہر شخص دوسرے کو حریف سمجھنے لگتا ہے۔ لہٰذا قناعت فرد کی ذاتی خوبی ہونے کے ساتھ ساتھ پورے معاشرتی ماحول کے لیے رحمت ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں قناعت کی عملی جھلکیاں

سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ ﷺ نے قناعت کو صرف زبانی نصیحت نہیں بنایا بلکہ اپنی زندگی میں برت کر دکھایا۔ گھر میں محدود غذا پر گزارا ہونے کے باوجود زبان پر شکوہ نہ آنا، ضرورت سے زائد جمع نہ کرنا اور جو آئے اسے ضرورت مندوں میں بانٹ دینا، یہ اسی قناعت و ایثار کا تسلسل ہے۔ اہلِ خانہ کی تربیت بھی اسی مزاج میں ہوئی؛ ازواجِ

مطہرات کی سادہ زندگی سیرت کی کتابوں کا معروف باب ہے۔ ان واقعات کی تفصیل مستند سیرت کی کتب میں دیکھی جا سکتی ہے؛ یہاں ان کا خلاصہ اس لیے پیش کیا گیا ہے تاکہ نظری اصول کی عملی شکل واضح ہو جائے۔

دوسری جھلک آپ ﷺ کی تعلیمات کے مفاہیم میں نظر آتی ہے جہاں کفاف یعنی بقدرِ ضرورت رزق کو پسندیدہ قرار دیا گیا اور غنا کو دل کی غنا سے تعبیر کیا گیا۔ تیسری جھلک آپ ﷺ کے مالی فیصلوں میں ہے: آپ ﷺ دنیاوی شان و شوکت سے بالکل بے نیاز رہے اور سہولتیں میسر آنے کے باوجود سادگی برقرار رکھی۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ یہ سادگی مجبوری نہیں انتخاب تھا، کیونکہ اختیار کے باوجود سادگی اپنانا ہی اصل فناء ہے۔ آج کے طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ قناعت غربت کا نام نہیں بلکہ دل کی وہ کیفیت ہے جو امیری میں بھی انسان کو متوازن اور تنگی میں بھی مطمئن رکھتی ہے۔

مادیت پرستی: مفہوم، اسباب اور نقصانات

مادیت پرستی سے مراد وہ رجحان ہے جس میں مال، چیزیں اور ظاہری شان ہی کو کامیابی اور عزت کا واحد پیمانہ سمجھ لیا جائے۔ اس رجحان کے اسباب میں اشتہارات اور سوشل میڈیا پر دکھاوے کی زندگی، دوسروں سے مسلسل موازنہ، تعلیم کو صرف آمدنی کا ذریعہ سمجھنا، خاندان و اداروں میں اخلاقی تربیت کی کمی اور صارفیت پر مبنی معاشی نظام شامل ہیں۔ جب ہر نئی چیز کو ضرورت بنا کر پیش کیا جائے تو انسان کی خواہشات کبھی ختم نہیں ہوتیں اور وہ قرض، نمائش اور بے چینی کے چکر میں پھنستا چلا جاتا ہے۔

مادیت پرستی کے نقصانات واضح ہیں: گھروں میں شادی بیاہ اور تقریبات کا خرچ استطاعت سے بڑھ گیا ہے، نوجوان ظاہری کامیابی نہ ملنے کو ناکامی سمجھ کر مایوسی کا شکار ہو رہے ہیں، دفتروں میں ناجائز آمدنی کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے، اور موبائل و برانڈز کی دوڑ نے طلبہ کو مطالعے سے دور کر دیا ہے۔ ذہنی صحت پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہیں؛ موازنے کی بیماری نے شکر کی جگہ احساسِ محرومی کو جنم دیا ہے۔ اس پس منظر میں قناعت کی تعلیم محض اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ ایک مکمل معاشرتی علاج ہے جس کی روک تھام پر عمل درآمد ناگزیر ہو چکا ہے۔

مادیت پرستی کی روک تھام کے لیے تجاویز

روک تھام کی پہلی تجویز تربیت پر توجہ ہے۔ گھر اور تعلیمی ادارے بچوں کو شروع سے ضرورت و خواہش کا فرق، شکر گزاری کی عادت اور سادہ زندگی کی قدر سکھائیں۔ نصاب میں سیرت کے قناعت والے ابواب کو کہانی اور عملی مثال کے انداز میں پڑھایا جائے۔ دوسری تجویز ذاتی محاسبہ ہے: ہر خریداری سے پہلے یہ سوال کہ آیا یہ ضرورت ہے یا دکھاوا، بجٹ بنا کر چلنا، اور فضول خریداری میں تاخیر کی عادت اپنانا مفید نتائج دیتا ہے۔ تیسری تجویز سوشل میڈیا کے استعمال میں توازن ہے؛ دکھاوے والے مواد کی پیروی کم کرنا اور شکر کا روزانہ جائزہ لینا دل کی بے چینی کم کرتا ہے۔

چوتھی تجویز سماجی رواجوں کی اصلاح ہے: شادی و تقریبات میں سادگی کو عزت کا معیار بنانا، دکھاوے کے اخراجات پر مشترکہ خاندانی اتفاق کرنا اور سادگی کی مثال قائم کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔ پانچویں تجویز سخاوت اور خدمت کو فروغ دینا ہے؛ جب انسان اپنی کمائی کا ایک حصہ دوسروں پر خرچ کرتا ہے تو مال کی محبت دل کی حکومت چھوڑ دیتی ہے۔ چھٹی تجویز ادارہ جاتی سطح پر ہے: میڈیا ذمہ داری سے صارفیت کی افراط کو کم کرے، تعلیمی ادارے سادگی کو نصاب کا حصہ بنائیں، اور علماء و اساتذہ قناعت کو جدید نفسیاتی و معاشی مثالوں کے ساتھ بیان کریں تاکہ نوجوان اسے عملی راستہ سمجھے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قناعت دل کا غنا ہے جو انسان کو سکون، اخلاقی استقامت، معاشی توازن اور وقت کی آزادی عطا کرتا ہے، اور سیرتِ نبوی ﷺ اس کی کامل عملی تفسیر ہے۔ مادیت پرستی اس کے برعکس بے چینی، حسد، قرض اور اخلاقی گراوٹ کا راستہ ہے۔ اس کی روک تھام کا آغاز کسی قانون سے پہلے دل کی تربیت سے ہوتا ہے: گھر کی سادگی، ادارے کی تعلیم، ذاتی محاسبہ، میڈیا کا توازن اور خدمت و سخاوت کی عادتیں مل کر معاشرے کا مزاج بدل سکتی ہیں۔ قانع معاشرہ ہی شاکر، پر سکون اور حقیقی معنوں میں خوش حال معاشرہ ہوتا ہے۔

سوال نمبر 5: حلم و بردباری کی اہمیت اور خاندانی زندگی کا استحکام (20 نمبر)

حلم اور بردباری کی اہمیت سیرتِ نبوی کی روشنی میں بیان کریں نیز خاندانی زندگی کے استحکام کے لیے حلم کی اہمیت پر نوٹ لکھیں۔

تعارف: حلم و بردباری کا مفہوم

حلم سے مراد غصے کے موقع پر خود کو قابو میں رکھنا، جذبات کے فوری ردِ عمل کے بجائے سوچ سمجھ کر برتاؤ کرنا اور دوسرے کی غلطی پر درگزر و نرمی سے کام لینا ہے۔ بردباری اسی کیفیت کا دوسرا نام ہے جس میں انسان اشتعال انگیز بات سن کر بھی توازن نہیں کھوتا، جواب دینے کی قدرت کے باوجود نرمی اختیار کرتا ہے اور معاملے کو بگاڑنے کے بجائے سنوارتا ہے۔ حلم کمزوری نہیں بلکہ طاقت کی علامت ہے، کیونکہ کمزور شخص وہی چاہے بھی تو بدلہ نہیں لے سکتا، جبکہ صاحبِ قدرت کا معاف کرنا اور غصہ پی جانا ہی اصل بہادری ہے۔ سورۃ آل عمران (3:134) کے مفہوم میں غصہ ضبط کرنے والوں اور لوگوں کو معاف کرنے والوں کی صفت کو نیک لوگوں کی نمایاں خوبیوں میں شمار کیا گیا ہے۔

اسی طرح سورۃ الشوریٰ (42:43) کے مفہوم میں صبر اور معافی کو بلند عزم کے کاموں میں گنا گیا ہے۔ ان مفاہیم سے واضح ہوتا ہے کہ حلم محض مزاجی نرمی نہیں بلکہ شعوری فیصلہ ہے جس میں انسان اپنے نفس، غصے اور انتقام کی خواہش کو قابو میں رکھ کر مسئلے کو عقلمندی سے حل کرتا ہے۔ سیرتِ نبی ﷺ اس وصف کی اعلیٰ ترین عملی مثال ہے، جہاں سخت ترین اشتعال کے مواقع پر بھی آپ ﷺ کا حلم و تحمل نمایاں نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر جواب میں پہلے حلم کی اہمیت سیرت کی روشنی میں بیان کی جائے گی اور پھر خاندانی زندگی کے استحکام میں اس کے کردار پر نوٹ پیش کیا جائے گا۔

سیرتِ نبوی ﷺ میں حلم و بردباری کی جھلکیاں

سیرت کی کتابوں میں آپ ﷺ کے حلم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ذاتی اہانت پر کبھی انتقام نہیں لیا، سخت بات کرنے والے سے نرمی سے پیش آئے اور جہالت پر مبنی رویے کو بھی تعلیم و شفقت سے بدلا۔ ناواقف شخص کی سختی پر صحابہ کو روک کر پیار سے سمجھانا اور مخالفین کی اذیتوں پر صبر کرنا اسی مزاج کے معروف نمونے ہیں جو تمام معتبر سیرت کی کتب میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان تاریخِ انسانی میں حلم و درگزر کی بے مثال مثال ہے، جس نے دلوں کو موہ لیا اور خون ریزی کے بجائے امن کا دور شروع ہوا۔

آپ ﷺ کے حلم کی ایک جھلک آپ ﷺ کے گھریلو معمولات میں بھی ملتی ہے: گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا، اہلِ خانہ کی بات سننا، ناراضی کی صورت میں بھی بے انصافی نہ کرنا اور اصلاح کے لیے سختی کے بجائے مناسب وقت و انداز اختیار کرنا۔ اسی طرح طویل خدمت کرنے والے خادم پر سخت سرزنش نہ کرنا سیرت کا وہ روشن پہلو ہے جو بتاتا ہے کہ حلم طاقت کے باوجود نرمی کا نام ہے۔ یہاں واقعات کے ملاصے دیے گئے ہیں؛ الفاظ و تفصیلات کے لیے مستند سیرت کی کتب کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اور کسی خاص گھریلو تنازعے میں شرعی و قانونی رہنمائی متعلقہ اہلِ علم و مجاز فورم ہی سے لینی چاہیے۔

حلم و بردباری کی اہمیت

حلم کی اہمیت کا پہلا پہلو یہ ہے کہ یہ غصے کے نقصانات سے بچاتا ہے۔ غصے میں کہا گیا ایک جملہ سالوں کے تعلق کو خاک کر سکتا ہے، غصے میں اٹھایا گیا قدم قانونی و معاشرتی مصیبت بن سکتا ہے، اور غصے کی عادت انسان کی صحت، نیند اور ذہنی سکون کو متاثر کرتی ہے۔ حلیم شخص لمحاتی اشتعال کو گزر جانے دیتا ہے اور پھر ٹھنڈے دل سے فیصلہ کرتا ہے، اس لیے اس کے فیصلے بھی درست ہوتے ہیں اور تعلقات بھی محفوظ رہتے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ حلم عزت بڑھاتا ہے۔ لوگ سخت مزاج سے ڈرتے ضرور ہیں مگر دل سے عزت حلیم کی کرتے ہیں، کیونکہ ڈر وقتی ہوتا ہے اور محبت و احترام پائیدار۔

تیسرا پہلو قیادت و تربیت میں اس کی افادیت ہے۔ استاد، والد، منتظم یا سردار، جو بھی دوسروں کو سنبھالتا ہے اس کے لیے حلم ناگزیر ہے؛ سخت مزاج قائد ہر چھوٹی غلطی کو تنازع بنا دیتا ہے جبکہ حلیم قائد لوگوں کی کمزوریوں کو سنوار کر ان سے بڑے کام لیتا ہے۔ چوتھا پہلو روحانی ہے: غصہ ضبط کرنا اور معاف کرنا قرآن و سیرت کی روشنی میں اللہ کی رضا کا ذریعہ ہے، اور یہ عمل انسان کے باطن کو بھی سکون عطا کرتا ہے۔ پانچواں پہلو سماجی امن ہے: بازار، دفتر اور سوشل میڈیا کے روزمرہ جھگڑے زیادہ تر اس لیے بڑھتے ہیں کہ کوئی ایک فریق حلم سے کام لینے کو تیار نہیں ہوتا؛ اگر ایک جانب بھی بردباری دکھائے تو اکثر تنازعات وہیں ختم ہو جاتے ہیں۔

خاندانی زندگی کے استحکام کے لیے حلم کی اہمیت

خاندان انسانی زندگی کی پہلی درسگاہ ہے اور اس کا استحکام بڑی حد تک حلم پر قائم ہے۔ میاں بیوی کے تعلق میں مزاج، پسند اور عادات کا فرق فطری ہے؛ اگر ہر اختلاف پر آواز بلند اور ہر کوتاہی پر طعنہ معمول بن جائے تو گھر میدانِ جنگ بن جاتا ہے۔ حلم میاں بیوی کو ایک دوسرے کی کمزوری برداشت کرنے، مناسب وقت پر بات کرنے اور بڑے مسئلے کو چھوٹی باتوں سے الگ رکھنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ ناراضی کے وقت خاموشی اختیار کرنا، تھکاوٹ و بیماری کے ایام میں درگزر کرنا اور بات کو جیت ہار کا مسئلہ نہ بنانا وہ عملی حلم ہے جس سے شادی شدہ زندگی پائیدار ہوتی ہے۔ سیرت کے گھریلو اصول کی روشنی میں بھی یہی اصول ملتا ہے کہ گھر میں نرمی و رحم کا رویہ رکھا جائے۔

والدین کے حلم کا اثر اولاد کی تربیت پر براہِ راست پڑتا ہے۔ جو بچے گھر میں چیخ و پکار دیکھتے ہیں وہی زبان باہر بھی استعمال کرتے ہیں، جبکہ حلیم والدین کے بچے اختلاف کو بات چیت سے حل کرنا سیکھتے ہیں۔ بچوں کی غلطی پر فوری سخت ردِ عمل کے بجائے وجہ سمجھنا، اصول واضح کرنا اور پیار سے پابند رکھنا حلم کی تربیتی صورت ہے۔ اسی طرح بزرگوں کی بڑھاپے کی کمزوری برداشت کرنا، بہن بھائیوں کے اختلافات کو ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر حل کرنا اور رشتہ داروں کی سخت باتوں کا جواب نرمی سے دینا خاندان کو ٹوٹنے سے بچاتا ہے۔ اکثر خاندانی تنازعات اصل مسئلے سے نہیں بلکہ سخت لہجوں سے بگڑتے ہیں؛ حلم وہ کیفیت ہے جو اس آگ کو بھڑکنے نہیں دیتی۔

حلم پیدا کرنے کے عملی طریقے

حلم ایک قابلِ اکتساب عادت ہے۔ پہلا طریقہ غصے کے لمحے میں توقف ہے: بات کا فوری جواب نہ دینا، جگہ بدل لینا یا کچھ دیر خاموش رہنا ایسی تدابیر ہیں جن سے اشتعال ٹھنڈا ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ دوسرے کی صورتِ حال کو سمجھنا ہے؛ اکثر سخت بات کہنے والا خود کسی تکلیف یا دباؤ میں ہوتا ہے، اس کی مجبوری کا خیال آتے ہی جوابی غصہ کم ہو جاتا ہے۔ تیسرا طریقہ نتائج پر نظر ہے: خود سے یہ سوال کہ اس غصے سے مجھے کیا حاصل ہو گا اور کیا کھونا پڑے گا، اکثر انسان کو روک لیتا ہے۔ چوتھا طریقہ معافی کی مشق ہے؛ چھوٹی باتوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کی عادت بتدریج بڑے حلم کی بنیاد بنتی ہے۔

پانچواں طریقہ سیرت کا باقاعدہ مطالعہ اور اچھے نمونوں کی صحبت ہے، کیونکہ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اسی کا رنگ پکڑتا ہے۔ چھٹا طریقہ خود احتسابی ہے: دن بھر کے غصے والے لمحات کا جائزہ لے کر آئندہ کی اصلاح کا عہد کرنا رفتہ رفتہ مزاج بدل دیتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ حلم کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ظلم و زیادتی کو برداشت ہی کیا جائے یا حقوق

کی قانونی و شرعی حفاظت چھوڑ دی جائے؛ حلم رویے کی نرمی کا نام ہے، حق کے تحفظ میں کمزوری کا نہیں۔ سنگین معاملات میں متعلقہ بزرگوں، اہلِ علم یا مجاز اداروں سے مدد لینا بھی عقل و حلم ہی کا تقاضا ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ حلم و بردباری سیرتِ نبوی ﷺ کا وہ درخشاں وصف ہے جو مرد کو غصے کے نقصانات سے بچاتا، اس کی عزت بڑھاتا اور اسے دوسروں کی رہنمائی کے قابل بناتا ہے۔ خاندانی زندگی میں یہ وصف محبت کی حفاظت، اولاد کی درست تربیت اور تنازعات کی پرامن تصفیے کی کنجی ہے۔ جس گھر میں حلم ہوتا ہے وہاں غلطیاں تو ہوتی ہیں مگر رشتے نہیں ٹوٹتے، اور جس گھر میں حلم نہیں ہوتا وہاں چھوٹی بات بڑا فساد بن جاتی ہے۔ آج کے تیز رفتار اور دباؤ بھرے دور میں حلم کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے؛ اسے اپنانا سیرت کی پیروی بھی ہے اور خوش گوار خاندانی زندگی کی ضمانت بھی۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com